

## "خطِ سلطان" از مسعود اشعر کے منتخب افسانوں کا تنقیدی جائزہ Critical Analysis of Selected Short Stories from Masood Ashar's "Khat-e-Sartan"

**DR. MUHAMMAD AFZAL BUTT**

Chairperson, Department of Urdu, Government College Women University, Sialkot, Pakistan  
(m.afzal@gcwus.edu.pk)

**CONFLICT OF INTEREST:** The author declares that there are no conflicts of interest related to the research, authorship, and/or publication of this article, and that the data presented have not been fabricated or falsified.

**FUNDING:** This research did not receive any specific grant or financial support from public, commercial, or not-for-profit funding agencies.

**PARTICIPANT CONSENT:** The author confirms that Informed consent was obtained from all participants, and confidentiality was duly maintained.

**KEYWORDS:** Urdu short story, Political consciousness, Symbolism, Modern alienation, Intellectual consciousness, Political oppression

**ABSTRACT:** Masood Ashar is a significant late twentieth-century Urdu short story writer whose work reflects emerging intellectual, cultural, and political consciousness within Urdu literature. His fiction, shaped by his engagement with journalism, addresses political oppression, social conflict, class disparity, and the alienation of modern individuals in rapidly changing societies. Ashar's second collection, 'Khat-e-Sartan' (1987), comprising seventeen stories, demonstrates thematic maturity through its nuanced exploration of individual-society tensions, moral ambiguity, and political instability. More than a collection of narratives, the work articulates the intellectual anxieties of its time through symbolic, restrained, and psychologically layered storytelling. The later compilation of Ashar's collections, 'Aankhon Par Dono Hath' and 'Khat-e-Sartan', into 'Kulliyat-e-Afsana (Saare Fasane)' provides a cohesive perspective on his evolving creative vision and the broader socio-political realities shaping his fiction. This article offers a focused analysis of selected stories: 'Bichhday Ka Geet', 'Khwab', and 'Ek Bohat Purani Kahani' to examine narrative structure, thematic continuity, and symbolic strategies central to Ashar's literary contribution, within postcolonial Urdu literary discourse and broader evolving modern sensibilities.



This work is licensed under a [Creative Commons Attribution-Non Commercial 4.0 International License \(CC BY-NC 4.0\)](https://creativecommons.org/licenses/by-nc/4.0/)

مسعود اشعر اردو افسانے کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے بیسویں صدی کے اواخر میں اردو افسانے کو ایک نیا فکری، تہذیبی اور سیاسی شعور عطا کیا۔ وہ صحافت اور ادبیات دونوں میں اپنی گہری بصیرت کے لیے معروف ہیں۔ اُن کی افسانہ نگاری زندگی کے ناہموار دھاروں، سیاسی جبر، فرد کی داخلی کشمکش، اور سماجی تناؤ کا عمیق اظہار ہے۔ مسعود اشعر کا دوسرا افسانوی مجموعہ "خطِ سلطان" ۱۹۸۷ء

میں لاہور سے سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سترہ افسانے شامل ہیں جو موضوعاتی گہرائی اور فکری چٹنگی کا مظہر ہیں۔ ان افسانوں میں فرد اور سماج کے درمیان کشمکش، جدید انسان کی بیگانگی، اور سیاسی عدم استحکام جیسے موضوعات کو نہایت مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے نے مسعود اشعر کو اردو افسانے کے ایک سنجیدہ اور باشعور فنکار کے طور پر مزید مستحکم کیا۔

"خطِ سرطان" کو محض ایک افسانوی مجموعہ نہیں بلکہ ایک عہد کے فکری اضطراب کا بیانیہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں شامل افسانے بظاہر سادہ بیانیے کے حامل ہیں، مگر ان کے پس منظر میں ایک گہری معنویت چھپی ہوئی ہے۔ مسعود اشعر کے اسلوب میں ایک مخصوص ٹھہراؤ، داخلی توازن اور علامتی اظہار کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ مجموعہ، اشاعتی لحاظ سے بھی اہم اس وقت ٹھہرا جب سنگ میل کے مدیر نیاز احمد صاحب نے یہ تجویز دی کہ مسعود اشعر کے دونوں مجموعے یعنی "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" اور "خطِ سرطان" کو یکجا کر کے ایک "کلیات افسانہ" کی شکل دی جائے۔ اس تجویز کو خود مسعود اشعر نے بھی سراہا اور اس طرح دونوں مجموعے کو یکجا کر کے "سارے فسانے" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ "سارے فسانے" نہ صرف ایک کتابی مجموعہ ہے بلکہ ایک فکری وحدت کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جو مسعود اشعر کے ادبی سفر کی جھلک دکھاتا ہے۔ یہ کلیات اردو افسانے کے سنجیدہ قاری کے لیے ایک ایسی دستاویز ہے جس سے نہ صرف مسعود اشعر کی تخلیقی ستوں کو سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اس عہد کے سماجی و سیاسی حالات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کلیات کی اشاعت کے بعد اردو کے معروف ناقدین، جیسے ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اسلم انصاری، اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ مسعود اشعر کا افسانہ محض کہانی نہیں بلکہ ایک فکری تجربہ ہے۔ اس مضمون میں ان کے منتخب افسانے "پچھڑے کا گیت، خواب، ایک بہت پرانی کہانی" اور بتاشوں پر چلنے والے" پر مختصر تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔

پچھڑے کا گیت: یہ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے جس میں مسعود اشعر نے آزادی پر قربان ہونے والوں کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ مختلف کرداروں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں قربانی کی مثال کسی آدمی کی نہیں بلکہ ایک درخت کی ہے۔ ایک ایسا خاموش درخت جو ہمارے سامنے کٹ رہا ہے اور ہم کچھ نہیں کر رہے حالانکہ وہ ایک درخت ہمیں کتنی سہولیات فراہم کرتا ہے۔ لیکن ہائی ٹیکنالوجی کے لیے وہ درخت کا نالازم ہے کہانی کے ایک کردار کو اس پر بے حد اعتراض ہے اس کردار کو کچھ یوں پیش کیا ہے۔

"سر پر لمبے لمبے کچھڑی بال اور بھی بکھر گئے تھے اور عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے جھانکتی

بڑی بڑی آنکھیں اور بھی بڑی ہو گئی تھیں جب اس نے درخت کو کٹتے دیکھا تھا" (۱)

اس کردار کو اعتراض اس لیے تھا کہ درخت ہمیں سایہ دیتے ہیں ہمیں آکسیجن فراہم کرتے ہیں اور کمیٹی والے اسے کاٹ کر ہماری ہی صحت کے ساتھ سمجھوتا کر رہے ہیں نقصان ہمارا ہے اور درخت ہمارے لیے قربان ہو رہا ہے۔ قربان ہونے والوں کے لیے اس افسانے میں ایک گیت بھی شامل کیا گیا جو کہ جون بائیر نامی ایک لڑکی بول رہی تھی:

"ڈونا ڈونا۔۔۔۔۔ ڈونا۔۔۔۔۔"

"میں جانتی ہوں"

بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔



اس مثال سے ثابت ہوا کہ کہانی کے کردار نے درختوں کی کٹائی کو کتنا ذہن پر سوار کر لیا ہے اور وہ دوستوں پر بھی غصہ اتار رہا ہے یہ اپنے دوستوں کو افسردگی کی حالت میں بتایا ہے کہ میں بہت کوشش کی اوپر تک آواز پہنچاؤں کہ خدا کے لیے درخت نہ کاٹو مگر وہ سنتے ہی نہیں اور دوچار گالیوں کے ساتھ ہی اس کہانی کو مسعود اشعر نے اختتام کی طرف کھیچا۔ مسعود اشعر کے افسانوں میں زمان و مکان واقعات و کرداروں سے الگ ہونے کی بجائے خود کرداروں کی مانند جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک بہت پرانی کہانی: یہ اس مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے جس میں مسعود اشعر نے ایک ایسا کردار بیان کیا ہے جو افسانے کے دوسرے کرداروں کو ایک سفر کے دوران ملا تھا جو اتنے بڑے ہجوم میں بھی ان سب کو متاثر کیے ہوتے تھا۔ مسعود اشعر کے افسانوں میں جس طرح وقت کے دودھارے ملتے اور پھر الگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اس کے ہاں فرد دو سطحوں پر اظہار پاتا ہے۔ ایک اس کا انفرادی روپ ہے اور دوسرا اجتماعی! چنانچہ اس کے افسانوں میں اکیلا آدمی اور ہجوم اپنا توازن برقرار رکھتے نظر آتے ہیں۔ فرد بمقابلہ ہجوم کا یہ انداز مسعود اشعر کو بہت پسند ہے۔ اس ایک کردار نے باقی کرداروں کو اپنی طرف کچھ یوں راغب کیا:

"ہم سب ٹرین کے ایک ڈبے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اکٹھے تو بہت سے لوگ ہوئے تھے مگر اس

لڑکے نے ہم چند لوگوں کو اس طرح کیجا کر دیا تھا کہ ہم سب کی دل چسپی، غرور، مقصد اور مفاد

ایک ہی ہو گیا تھا اور وہ تھائی بہت معصوم اور بھولی بھالی شکل والا لڑکا" (۵)

مسعود اشعر نے فرد کے افراد سے کٹ جانے کے وقوع اور پھر اپنی ذات کے نہاں خانے میں دفن ہو جانے کا کتبہ لکھا ہے۔ یہ مسعود اشعر کے لیے چہروں سے مل کر جنم لینے والی ایک کہانی ہے۔ مختلف اور متنوع چہروں سے مل کر جنم لینے والی ایک بہت بڑی تصویر ہے چنانچہ وہ اس افسانے میں اس ہجوم کو ساتھ لے کر چلتے دکھائی دیتے ہیں:

"ہاں! مجبور ہیں اور ہجوم میں تو عجب تماشہ نظر آتا ہے سب ایک بھی ہوتے ہیں اور سب الگ

الگ بھی۔ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہجوم میں

رنگ برنگے چہرے دیکھ کر میرا ہنس ہنس کر بڑا حال ہو جاتا ہے" (۶)

افسانے کی ابتداء میں قاری کو سمجھنا مشکل لگتا ہے کہ آخر مصنف بات کیا کرنا چاہتا ہے لیکن جب آہستہ آہستہ اختتام کی طرف بڑھتا ہے تو افسانے میں چھپا مفہوم قاری پر واضح ہو جاتا ہے۔ مسعود اشعر کے افسانے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا:

"ان کا انداز افراد کو مسترد کر دینے کا ہے۔ انفرادیت پسند مسعود اشعر اور ان کے افسانوں کا تنہا

فرد اپنی ذات میں تو ایک ہجوم بن سکتا ہے لیکن وہ کسی ہجوم کے رنگ برنگے چہروں میں اپنا رنگ

برنگا چہرہ شامل کر دینے کو تیار نہیں" (۷)

افسانے میں موجود مرکزی کردار کو مسعود اشعر نے آخر تک مضبوط رکھا ہے کہیں بھی اس کردار کو ہلکا نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے شروع سے آخر تک اپنا موضوع نہیں چھوڑتے۔

خوابوں کی زندانی: یہ اس مجموعے کا تیسرا افسانہ ہے جس میں کردار خوابوں میں قید ہے۔ وہ جب بھی آنکھ بند کرتا ہے تب اُسے آنے والے خواب تنگ کرتے ہیں۔ اس افسانے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے افسانے تاریخ کا اشاریہ قرار پائیں گے اور مسعود اشعر بھی ایک ایسے تاریخ ساز افسانہ نگار ہیں۔

"کالی رات کے اندھے کنویں سے نکلنے والی سیاہ چیچ نے ان سب کے دلوں کو ایک ہی تار میں پرو دیا تھا اور وہ سب اپنے آپ کو ایک نجوم۔ ایک مجمع سمجھتے تھے۔ اپنے خالص ذاتی "آج" کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے تمہارہ گئے تھے" (۸)

مسعود اشعر کی تاریخ اس کے اپنے وزن کی شکل کردہ ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے وہ "خالص ذاتی آج" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ زندگی کی رم خوردہ لمحات میں سے کسی ایک کو پکڑنے کے مترادف ہے لیکن لمحہ اور تعلق میں بہت فرق ہے۔ تعلق تو جال میں آسکتی ہے اور اسے سلیقہ سے الہم میں سجایا بھی جاسکتا ہے لیکن لمحہ ہمارے جال میں آنے کے برعکس خود ہمیں اپنے سیال دام میں اسیر کر لیتا ہے۔ یوں کہ گریز پالمحات کے الہم میں خود ایک مردہ تعلق کی مانند سجاد یئے جاتے ہیں جیسی تو مسعود اشعر کے نزدیک یہ اہم ترین مسئلہ ہے تو انھوں نے افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

"اس روز صبح سورج کسی بہت پرانے فرسودہ اور بوسیدہ سورج کی بازگشت معلوم ہوتا تھا"

"اپنے خالص ذاتی آج کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے"

"آج کا مسئلہ" (۹)

تجربیدی افسانے پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں یا کیے جاتے ہیں ان میں سے یہ اعتراض بہت مشہور ہے یہ افسانہ دوروں بینی کی پیداوار ہے۔ یہاں ذات کی عکاسی مریضانہ دروں بینی کی پیداوار نہیں بلکہ ذات دوسروں کی تفہیم کے لیے ایک مکمل استعارہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے ہاں یہ افسانہ ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ مسعود اشعر کا فرد نجوم سے کٹ کر دوسرے فرد سے بھی رابطہ استوار کرنے کا خواہاں نہیں!

"اس نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا، وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص اس سے کیوں

بات کر رہا ہے؟ اور ایسی ذاتی سی بات اس نے سوچا وہ اس کا جواب دے پھر سوچا کہ غصے میں ایسی

ویسی بات منہ سے نکل گئی تو کیا فائدہ۔۔۔" (۱۰)

افسانے کا کردار غصے میں ایسی ویسی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ یہی حال مسعود اشعر کا ہے جو غصہ میں ایسی ویسی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتے۔ شاید اسی لیے ان کے بیشتر افسانوں میں ناتمامی کا احساس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا ہے:

"مسعود اشعر کے افسانے ناتمامی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے مکمل ہو جاتے ہیں اس کے افسانوں کو

پڑھ کر سکون اور عافیت کا احساس ہونے کے برعکس بے چینی تذبذب اور سب سے بڑھ کر

تشکیک کے کانٹے چھبے لگتے ہیں۔ وہ اتنا کنجوس ہے کہ اپنے قاری کی تشنگی دور کرنے کے لیے

اسے شبہم بھی نہیں دیتا۔ اسے معلوم ہے کہ یہ مٹی بجز اور بانجھ ہے اسی لیے وہ اس ذرا سی مٹی بھی ضائع کرنے کو تیار نہیں۔ یہی مسعود اشعر کافن ہے اور اسی میں اس کی انفرادیت مضمر ہے" (۱۱)

مسعود اشعر کے لیے علامت تجرید اور تکنیک کے ضوابط کی توڑ پھوڑ محض سامان دل لگی نہیں بلکہ یہ تو عصری شعور کی ترجمانی کے لیے اہم ترین آلات ہیں۔ وہ اپنی سائیکے کے حوالہ سے دوسروں کی پہچان کرتا ہے۔

بتاشوں پر چلنے والے۔ افسانہ دو افراد پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مخاطب ہیں اور ستاروں کی باتیں کرتے ہیں اور بتاشوں پر چلنے کی بات کو بڑھاتے ہیں۔ کہانی کا کردار (لڑکا) کھڑکی میں کھڑا ہے اور آسمان کو ستاروں سے سجاد کھیر رہا ہے۔ وہ اتنا گن ہے ان تاروں کو دیکھنے میں کہ اسے یہ طے کرنا مشکل لگ رہا ہے کہ وہ اس وقت کھڑکی سے باہر ہے یا اندر کی جانب ہے۔ کہانی کا دوسرا کردار (لڑکی) اس طرف دیکھ رہی ہے اور کہانی سننے کے لیے بے چین ہے۔

"ٹھہر ڈورا آہستہ آہستہ سناؤ، ٹھہر ٹھہر کر، سوچ سوچ کر، کسی بھی کہانی کا کلا ٹمیکس جلدی نہیں آ جانا چاہیے دھیرے دھیرے سانس روک کر کلا ٹمیکس کر طرف بڑھنا چاہیے۔ اچانک کلا ٹمیکس آ جانے سے سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور یہ طلسم ہی تو ہے جس کے لیے۔۔۔۔۔" (۱۲)

کہانی کے کردار نے بات کو گھما پھرا کر انیما موڑ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ کہانی کو طول دینے کی کوشش کر رہا ہے مگر وہ کہانی کو طول نہیں دینا چاہتی بلکہ اپنی کہانی کو آسان کر کے سنانا چاہتی ہے۔ لیکن میں کہانی کے اچانک اور یک لخت کلا ٹمیکس کے عذاب سے بچنا چاہتا ہوں اور اسے یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ کلا ٹمیکس کو آرام سے سنا لے لیکن وہ میری کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

اس لمحے کو بہت طویل کر دینا چاہیے۔ جیسے ہم سانس روک کر کھڑے ہوں"

"مگر سانس روکنے سے عمر تو لمبی نہیں ہوتی"

"میں گھبر اجاتا ہوں اور پھر اپنے پیروں کے نیچے دیکھتا ہوں" (۱۳)

بتاشوں پر چلنا ایک کردار کے لیے بلکہ دونوں کے لیے محال ہو رہا تھا دونوں الگ الگ انداز میں محبت کر رہے تھے اور الگ الگ انداز سے تاروں اور بتاشوں پر چل رہے تھے۔ مسعود اشعر کا انداز ہر افسانے میں منفرد ہے غیر جانبداری اور ناواہستگی کی کیفیت کو اس افسانے کا موضوع قرار دیا ہے۔ مسعود اشعر اپنی سائیکے کے لحاظ سے دوسرے لوگوں کو جانتے ہیں۔ اس لیے نہ وہ باطن سے خوفزدہ ہے اور نہ خارج CULT کلٹ بنانے کی ضرورت ہے۔ وہ بے ریلٹی سے بھی خوفزدہ نہیں ہے کہ آج بے ریلٹی فرد، افراد اور زندگی کو دیکھنے کے لیے نیا تناظر مہیا کرتی ہے۔ اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر سیلم اختر کی رائے:

"یاس اور ناامیدی مسعود اشعر کے ہاں بھی ہے مگر اس کے ہاں یاس اور ناامیدی زندگی سے

خواب نکل جانے کی بنا پر جنم لیتی ہے اور پھر بتاشوں پر چلنے والے" میں اس نے اسی نائب میر کو

ایک اور روپ میں پیش کر کے اسے آج کا استعارہ بنا دیا ہے" (۱۴)

مسعود اشعر نے اپنے انداز میں افسانے کے جدید اسلوب سے بات کہنے یا بات چھپانے کا کام لیا ہے۔ مسعود اشعر نے نائٹ میئر کو اس افسانے سے تشبیہ دی ہے:

"ستارے بہت ہیں اور وہ سب میرے دوڑتے پیروں کے نیچے ہیں۔ میں دوڑ رہا ہوں۔ تاروں بھرے کھیت۔۔۔ بتاشوں پر، جو پہلے بن پانی بھی گھل جاتے ہیں مگر اب۔۔۔ پتھر ہیں میرے پاؤں کے نیچے، میرے پاؤں زخمی ہو چکے ہیں۔ پتھروں سے رگڑ کھا کھا کر اور میں دوڑ رہا ہوں۔ اب میرے اندر چٹیل میدان کی سنسان خاموشی بھوم کرتی ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتی ہے اب میں اکیلا نہیں ہوں۔ تنہا نہیں ہوں ایک بھوم ہے میرے ساتھ جو دوڑ رہا ہے ہاتھ سے نکتے لپینے کی بوند بتاتی ہے کہ میرے اندر گرمی آگئی ہے اور اب یہ حرارت آگے بھی منتقل کی جاسکتی ہے، محنت کا یقین حاصل کرنے لے لیے کسی جواز کسی دلیل اور کیس وجہ کے بغیر؟" (۱۵)

مسعود اشعر کے افسانوں میں "بھوم" اپنی ایک خاص معنویت اور مخصوص تلازمہ رکھتا ہے چنانچہ بھوم کے اس مخصوص مفہوم کے تناظر میں اس افسانے کی یہ اختتامی سطور اور بھی گہری معنویت اختیار کر جاتی ہے۔

"خطِ سرطان" میں شامل افسانے نہ صرف فرد کی سطح پر داخلی زخموں کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ ریاستی جبر، معاشرتی بے حسی اور شناخت کے بحران جیسے پیچیدہ موضوعات کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ افسانوی کرافٹ کے لحاظ سے مسعود اشعر نے علامت، تجرید، اور بیانیہ کے درمیان ایک متوازن فضا قائم کی ہے۔ ان کے ہاں کوئی بات براہ راست نہیں کہی جاتی، بلکہ اشاروں، تمثیلات اور علامتی اظہار کے ذریعے قاری کو سوچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

مسعود اشعر کا افسانوی مجموعہ "خطِ سرطان" اردو ادب میں ایک اہم تخلیقی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شامل افسانے زندگی کے داخلی و خارجی منظر نامے کو ایک ایسی فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہیں جو اردو افسانے کی روایت میں منفرد ہے۔ "سارے فسانے" کے عنوان سے اس کلیات کی اشاعت نے مسعود اشعر کے فکری تسلسل اور ادبی شعور کو مکمل شکل دی۔ اس کلیات نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو افسانہ اب محض واقعہ نگاری یا رومانی جذبے کا اظہار نہیں، بلکہ یہ ایک فکری اور تہذیبی اظہار کا موثر ذریعہ ہے، جس میں فرد، ریاست، اور معاشرہ سب ایک ساتھ بولتے ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم کا کہنا ہے:

"اپنے افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے جب ہم اس بارہ برس کی مدت میں لکھے ہوئے افسانوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے چہرے خوشی سے معمور اور گردنیں فخر سے بلند ہو جاتی ہیں۔ یہ دور بلاشبہ ہماری افسانہ نگاری کا عہد زریں ہے جس میں اچھے افسانوں کے ساتھ اور نئے افسانہ نگاروں کے ساتھ جن کا مرتبہ اساتذہ فن کا ہے ایسے افسانہ نگارہ بھی ملتے ہیں جنہوں نے

اپنی محنت اور کاوش اور اپنی فکر و نظر کی بدولت اپنے لیے ایسا تمام پیدا کیا جسے کوئی بھی بلا نہیں  
سکتا" (۱۶)

بحیثیت مجموعی مسعود اشعر کا مجموعہ "خطِ سرطان" اپنے عہد کے فکری اضطراب، سماجی کشمکش اور فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ کو جس فنی مہارت سے اجاگر کرتا ہے، وہ اسے اردو افسانے کی روایت میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ منتخب افسانوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مسعود اشعر نے تجریدیت، اور علامتی بیانیے کے ذریعے فرد اور معاشرے کی پیچیدہ گتھیوں کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ ان کے کردار خواب، تنہائی اور بے معنویت کے درمیان جھولتے ہوئے اس عہد کی فکری شکست و ریخت کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ یوں "خطِ سرطان" محض کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری دستاویز ہے، جو اردو افسانے کو نئے مکالمے، نئی بصیرت اور نئے اسلوب سے روشناس کراتی ہے۔

### حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۲
- ۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۵
- ۴۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵
- ۵۔ ایضاً، ص ۳۷
- ۶۔ ایضاً، ص ۳۹
- ۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۶
- ۸۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷
- ۹۔ ایضاً، ص ۵۸
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۵۸
- ۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۳
- ۱۲۔ ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۷
- ۱۲۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۶۷
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۶۷
- ۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵۱
- ۱۵۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۹۱

۱۶-وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، گنج شکر پریس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۴

### References in Roman Script:

1. Masood Ashar, Sarey Fasaney, Sang e Meel Publications, Lahore, 1997, p. 11
2. Ibid, p. 12
3. Saleem Akhtar, Dr., Afsana aur Afsana Nigar, Sang e Meel Publications, Lahore, 2013, p. 215
4. Masood Ashar, Sarey Fasaney, Sang e Meel Publications, Lahore, 1997, p. 15
5. Ibid, p 37
6. Ibid, p 39
7. Saleem Akhtar, Dr., Afsana aur Afsana Nigar, Sang e Meel Publications, Lahore, 2013, p. 216
8. Masood Ashar, Sarey Fasaney, Sang e Meel Publications, Lahore, 1997, p. 57
9. Ibid, p 58
10. Ibid, p 58
11. Saleem Akhtar, Dr., Afsana aur Afsana Nigar, Sang e Meel Publications, Lahore, 2013, p. 217
12. Masood Ashar, Sarey Fasaney, Sang e Meel Publications, Lahore, 1997, p. 67
13. Ibid, p 67
14. Saleem Akhtar, Dr., Afsana aur Afsana Nigar, Sang e Meel Publications, Lahore, 2013, p. 51
15. Masood Ashar, Sarey Fasaney, Sang e Meel Publications, Lahore, 1997, p. 91
16. Waqar Azeem, Professor, Dastaan sey Afsaney tak, Ganj Shakar Press, Lahore, 2018, p. 34



**Dr. Muhammad Afzal Butt** serves as the Chairperson and Associate Professor in the Department of Urdu at Government College Women University, Sialkot, Pakistan. He received his PhD from the National University of Modern Languages, Islamabad. An accomplished scholar, his research spans Urdu fiction and poetry. Dr. Butt has contributed forty-five scholarly articles to the field and is the author of two acclaimed books.